

- تمام احمدی جماعتیں اپنے اپنے ہاں نوجوانوں کو منظم کریں
- چھوٹے بچوں کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے
- قوموں کی ترقی کا نوجوانوں سے گہرا تعلق
- مجلس خدام الاحمدیہ کے قیام کی ضرورت
- سلسلہ کے وقار کا تحفظ اور اسلام اور احمدیت کی ترقی کیلئے
- کام کی ترغیب مجلس خدام الاحمدیہ کا مقصد
- بچوں میں اخلاق حسنہ کی داغ بیل ڈالنا
- بچوں میں تین بنیادی عادات پیدا کریں
- ۱- محنت کی عادت ۲- سچ کی عادت ۳- نماز کی عادت

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۵-اپریل ۱۹۳۸)

”گذشتہ خطبات میں میں نے مجالس خدام الاحمدیہ کے متعلق بعض باتیں کہی تھیں اور اسی سلسلہ میں میں آج پھر جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قومی نیکیوں کے تسلسل کے قیام کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس قوم کے بچوں کی تربیت ایسے ماحول اور ایسے رنگ میں ہو کہ وہ ان اغراض اور مقاصد کو پورا کرنے کے اہل ثابت ہوں جن اغراض اور مقاصد کو لے کر وہ قوم کھڑی ہوئی ہو۔ جب تک کسی قوم کا کوئی خاص مقصد اور مدعا نہیں ہوتا، اس وقت تک اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کو اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق کوئی تعلیم دلا دے یا عام علوم سے واقفیت بہم پہنچا دے یا بعض پیشے انہیں سکھا دے۔ جب کوئی قوم اتنا کام کر لیتی ہے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش سمجھی جاتی ہے۔

لیکن جب کوئی قوم ایک خاص قوم کا مدعا اور مقصد نوجوانوں کے دماغوں میں راسخ کر دیا جائے مقصد اور مدعا لے کر کھڑی ہوئی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد اور مدعا کو نوجوانوں کے ذہنوں میں پورے طور پر داخل کرے اور ایسے رنگ میں ان کی عادات اور خصائل کو ڈھالے کہ وہ جب بھی کوئی کام کریں خواہ عاداتا کریں یا بغیر عادت کے کریں، وہ اس جہت کی طرف جارہے ہوں جس جہت کی طرف اس قوم کے اغراض و مقاصد اسے لئے جارہے ہوں۔

جب تک کسی قوم کے نوجوان اس رنگ میں کام نہیں کرتے اس قوم کی ترقی کا نوجوانوں سے گہرا تعلق وقت تک اسے ترقی حاصل نہیں ہوتی۔ رسول کریم ﷺ جب تشریف لائے ہیں اس وقت عرب کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس وجہ سے جو بات بھی آپ بیان فرماتے وہ عربوں کے لئے نئی ہوتی اور ان میں سے ہر شخص جو مسلمان ہوتا، اس بات کو ذہن میں رکھ کر مسلمان ہوتا تھا کہ پچھلی تمام باتیں اس نے ترک کر دینی ہیں۔ پس اس زمانہ میں مسلمان ہونے کا مقصد اور مدعا آپ ہی آپ سامنے آجاتا تھا اور کوئی خاص زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ ایک دفعہ ہر شخص یہ فیصلہ کر لیتا تھا کہ اسے اپنی گذشتہ تمام باتیں ترک کرنی پڑیں گی اور نئے مقاصد، نئی اغراض، نئی شریعت اور نئے احکام اس کے سامنے ہونگے۔

خالص تشریحی سلسلے کے مقابلے پر خالص اصلاحی سلسلے کو زیادہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

لیکن جب کوئی ایسا سلسلہ شروع ہو جس کی بنیاد پہلے مذہب پر ہو اور وہ خالص اصلاحی سلسلہ ہو، تشریحی نہ ہو تو اس کے لئے اس مقام میں پہلی جماعتوں سے زیادہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض قسم کی دقتیں پہلی جماعت کو زیادہ ہوتی ہیں۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بعض قسم کی دقتیں اصلاحی سلسلہ کو زیادہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی دقتوں میں سے ایک دقت یہ ہے کہ ایسے سلسلہ کے افراد کو اس سلسلہ کے مقاصد اور

اغراض سمجھانے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جب نوجوانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا دین کوئی نیا دین نہیں تو قدرتی طور پر ان کا ذہن یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے جن میں ہمارے آباء نے غلطی کی اور وہ اصل شریعت سے دور جا پڑے، ہر کچھلی چیز کو ہم نے قائم کرنا ہے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن میں کوئی امتیازی بات نہیں آتی اور وہ اس امر کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ ہم میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے لیکن جب نیا دین ہو یا پہلے دین کی بعض باتوں میں تغیر و تبدل ہو تو وہ ہر قدم کے اٹھاتے وقت یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں جی! یہ کام ہم نے اس طرح کرنا ہے یا اس طرح۔ حضرت مسیح ناصری کے زمانہ میں جب آپ کے متبعین کے دلوں میں قیہوں اور فریسیوں کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم ان کی باتوں کو مانیں یا نہ مانیں اور انہوں نے حضرت مسیح ناصری سے یہی سوال کیا تو چونکہ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں شریعت موسویہ میں لوگوں نے زیادہ تغیر پیدا نہیں کیا تھا۔ چند نئی باتیں تھیں جو حضرت مسیح نے اپنے پہاڑی وعظ میں بتادیں اس لئے حضرت مسیح نے فرمایا قیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو۔ لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔“ (متی ۲۳/۳-۲) گویا بد عقیدگی ان میں کم تھی اور بد اعمالی زیادہ تھی۔ اسی لئے آپ نے یہ ہدایت دی کہ جو قیہی اور فریسی کہتے ہیں اس پر بے شک عمل کرو مگر ان کے اعمال کی نقل نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کی حالت اس زمانہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس زمانہ میں مثلاً تورات میں بہت سے تغیرات کئے جا چکے ہیں مگر باوجود تغیرات کے اور باوجود تحریف و الحاق کے یہودی اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہماری کتاب محفوظ ہے۔ مگر ہمیں ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے جو اس کے بالکل انٹ چلتی ہے۔ یعنی تورات میں تو تبدیلی ہو چکی تھی اور یہودی قوم یہ اصرار کرتی تھی کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر قرآن جو کہ بالکل محفوظ ہے۔ اس کے متعلق مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اس کی کئی آیتیں منسوخ ہیں۔ اب یہ کتنا عظیم الشان اختلاف ہے۔ اس زمانہ کے یہودیوں اور اس زمانہ کے مسلمانوں میں وہ باوجود کتاب کے بگاڑ جانے کے کہتے تھے کہ ہماری کتاب بالکل محفوظ ہے اور مسلمان باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کتابتہ کے اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں اور اس کے ایک حرف اور ایک شے کی تبدیلی بھی ناممکن ہے، مسلمان یہ کہتے ہیں اس کی بہت سی آیتیں منسوخ ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں قرآنی احکام پر عمل کرنے کا جو ش باقی نہیں رہا۔ کیونکہ انہیں خدا تعالیٰ کے کلام میں شک پیدا ہو گیا اور جب کسی حکم کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے تو جو ش باقی نہیں رہتا اور ہر آیت پر عمل کرتے وقت انسانی قلب میں یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے جس آیت پر میں عمل کر رہا ہوں یہ منسوخ ہی ہو۔ چنانچہ پانچ آیتوں سے لیکر چھ سو آیتوں تک منسوخ قرار دی جاتی ہیں۔ یعنی بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم کی پانچ آیتیں منسوخ ہیں اور بعض نے زیادہ۔ یہاں تک کہ بعض علماء نے منسوخ آیات کی تعداد چھ سو تک پہنچا دی ہے۔ اب چھ سو آیتیں قرآن مجید کا ایک معتد بہ حصہ ہیں جن کو اللہ کر لیا جائے تو ایک خاصہ حصہ علیحدہ ہو جاتا ہے مگر مسلمانوں کو اس امر کی کوئی پروا نہیں۔ ان کی کتابوں میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں اور اب تک مسلمان اس کے

قائل ہیں۔ شیعہ لوگوں نے گو اس رنگ میں قرآنی آیات کو منسوخ قرار نہیں دیا، مگر انہوں نے اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ قرآن کریم کے بعض حصے اڑائے گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق اور اس کی صفات کے متعلق مسلمانوں میں بیسیوں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ شروع سے مسلمانوں میں یہ غلطیاں پائی جاتی تھیں۔ بلکہ قریب زمانہ میں آکر مسلمانوں میں یہ غلطیاں پیدا ہوئی ہیں ورنہ قرون اولیٰ کالٹریچر انہیں عقائد کی تائید کرتا ہے جو آج ہماری طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ سوائے اس حصہ قرآن کی تشریح کے، جو اس زمانہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ موجودہ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم کے بعض حصے ایسے ہیں جو پہلے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے اور بعض حصے ایسے ہیں جو خصوصیت سے اس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس جو حصہ قرآن کریم کا پہلے زمانہ سے تعلق رکھتا تھا اس میں قرون اولیٰ کے صحابہ، آئمہ اور مجددین ہماری ہی تائید میں نظر آتے ہیں اور یہ تمام ان کی کتابوں میں اب تک موجود ہیں۔ گو بد قسمتی سے مسلمان انہیں بھول چکے ہیں۔ غرض اس وقت نہ صرف مسلمانوں کے اعمال میں نقص ہے بلکہ ان کے عقائد اور ان کے خیالات بھی قابل اصلاح ہیں۔ ایسی حالت میں جب تک نوجوانوں میں بیداری پیدا نہ کی جائے اور انہیں یہ ہدایت نہ کی جائے کہ وہ اپنا قدم پھونک پھونک کر رکھیں اس وقت تک ہم میں بھی بعض غلطیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہم ہمیشہ کہتے رہتے ہیں اور یہی صحیح امر ہے کہ قرآن کریم کی تبدیلی ناممکن ہے۔

ہم ان غلطیوں کو دور کرنے کیلئے کھڑے ہوئے ہیں جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس

ہم صرف ان غلطیوں کو دور کرنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے خدام الاحمدیہ کا قیام ضروری ہے کیلئے کھڑے ہوئے ہیں جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں اور چونکہ اس رنگ میں انسان بعض دفعہ سست بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے کام کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں بہت زیادہ بیداری اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ قوم کے نوجوانوں کے اندر اس قسم کی بیداری اور ہوشیاری پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر جگہ مجلس خدام الاحمدیہ قائم کی جائے اور اس میں ایسے نوجوان شامل کئے جائیں جو عملی رنگ میں اپنی ایسی اصلاح کرنے کیلئے تیار ہوں کہ ان کا وجود دوسروں کے لئے نمونہ بن جائے۔ علاوہ ازیں بعض اور بھی نقائص ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے۔

زمانہ کی مخفی رو کا اثر ہماری جماعت پر نہ ہو۔ خدام الاحمدیہ کے قیام کے غرض و غایت

اور جو زمانہ کی مخفی رویا و رشہ کے اثرات کے ماتحت ہماری جماعت کے بعض افراد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسی مجالس کے قیام کی ایک غرض ان نقائص کو دور کرنا بھی ہوگی۔ مثلاً ہندوستانی ایک عرصہ سے غلامی کی زندگی بسر

کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور میں نے بارہا بتایا ہے کہ غلامی کی زندگی اپنے ساتھ بعض نہایت ہی تلخ اور ناخوشگوار نتائج لاتی ہے۔

مثلاً غلامی کی ذہنیت جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے وہ کبھی کوئی بڑا کام غلام قوم اور آزاد قوم میں فرق نہیں کر سکتے۔ فاتح اقوام ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری تجارت اعلیٰ ہو، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری دفاعی کوششیں مضبوط ہوں، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہمارا تعلیمی معیار زیادہ بلند ہو، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری صنعت و حرفت نہایت بلند پایہ ہو، اسی طرح اور بیسیوں باتیں ہیں جو ان کے دلوں میں جوش پیدا کرتی رہتی ہیں اور ہر سال ان باتوں پر جھگڑے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قوم میں ہیداری اور بلند خیالی پیدا ہو جاتی ہے مگر غلام قوم کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تمام جدوجہد صرف اس امر پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ مزدوری کی اور پیٹ پال لیا، یاد رے گئے اور تعلیم حاصل کر لی۔ بظاہر یہ ایک آرام کی زندگی نظر آتی ہے مگر دماغی لحاظ سے قتل عامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ تمام قوم کا ذہن مردہ کر دیا جاتا ہے اور وہ قوم مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال بالکل اس طوطے کی سی ہو جاتی ہے جسے کئی سال تک پنجرے میں بند رکھنے کے بعد جب آزاد کیا جاتا ہے تو وہ ادھر ادھر پھدک کر پھر پنجرے میں ہی آ بیٹھتا ہے۔ کیونکہ اڑنے کی ہمت اس میں باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح غلام قوموں میں سستی اور غفلت کو امن اور آرام سمجھا جاتا ہے اور امتگوں کا نقد ان اس قوم میں اطمینان قرار پاتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی شخص یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا دل امتگوں سے بالکل خالی ہے اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ دیکھو مجھے کیسا امن اور چین نصیب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی جدوجہد اور ترقی کے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ غرض ان عیوب اور نقائص کو دور کرنا بھی ہمارے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے وہ انسانی امتگوں اور جذبات کو کچلتی نہیں بلکہ انہیں بڑھاتی اور ترقی دیتی ہے۔ وہ تعلیم ہمیں یہی بتاتی ہے کہ خدا نے کسی انسان کو غلام نہیں بنایا اور کوئی انسان کسی دوسرے کو غلام بنا بھی نہیں سکتا جب تک وہ خود غلام نہ بن جائے۔ اس تعلیم کے ماتحت ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ترقی کا جب کوئی ایک راستہ ہمارے لئے مسدود ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بعض اور راستے ہمارے لئے کھول دیتا ہے اور اگر ہم ان راستوں کو اختیار کریں تو بالکل ممکن ہے کہ جو آج ہم پر افسر ہیں وہ کل ہمارے غلام ہو جائیں۔

مثلاً انہیں ذرائع میں سے ایک ذریعہ اخلاقی برتری کے ہوتے ہوئے کوئی قوم غلام نہیں رہ سکتی تبلیغ ہے یا اپنی اخلاقی برتری کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ دنیا میں اخلاقی برتری کے ہوتے ہوئے کبھی کوئی قوم غلام نہیں ہو سکتی۔ غلام وہی قوم ہوگی جو اخلاق میں بھی پست ہوگی۔ ہمارے ملک میں عام طور انگریزوں کو برا سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ان بعض خیالات اور عقائد کو مستثنیٰ کر کے جن میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور جن میں ہم انہیں غلطی پر سمجھتے ہیں، عملی رنگ میں ان کو

دیکھا جائے تو ایک ہندوستانی اور انگریز میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک انگریز کی کوشش، اس کی جدوجہد، اس کی قربانی اور اس کا ایثار اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی کی جدوجہد کی اس سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔ وہ یورپ سے چلتے اور ہندوستان میں آکر ساہا سال تک تبلیغ کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ پادری کیا ہیں۔ انگریزوں نے انہیں اپنے سیاسی غلبہ کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ پھر اگر ان کی تبلیغ کا ذکر آئے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جی ان کی تبلیغ اپنے فائدہ کیلئے ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے جو قربانیاں کرتے ہیں کیا اس قسم کی قربانیاں ایک ہندوستانی نہیں کر سکتا؟ وہ چالیس چالیس، پچاس پچاس بلکہ ساٹھ ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہتے ہیں۔ یہیں بوڑھے ہوتے اور یہیں مر جاتے ہیں اور واپس جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ مگر ایک ہندوستانی یا تو آوارہ ہو کر گھر سے نکلے گا یا اگر آوارہ نہ ہو گا تو غیر ملک میں جانے کے چند سال کے بعد ہی شور مچانا شروع کر دے گا کہ مجھے واپس بلوالو۔ غرض یا تو وہ آوارہ ہو کر گھر سے نکلتا ہے اور اگر آوارہ ہو کر گھر سے نہیں نکلتا تو غیر ممالک میں ہمیشہ بے کل رہتا ہے اور واپسی کے لئے کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یورپین قومیں آوارہ ہو کر اپنے ممالک سے نہیں نکلتیں۔ وہ کام کے لئے نکلتی ہیں اور پھر جب کسی دوسرے ملک میں اپنا کام شروع کر دیتی ہیں تو گھبراتی نہیں اور جو تکلیف بھی انہیں برداشت کرنی پڑے، اسے خوشی سے برداشت کرتی ہیں۔ مگر یہ نتیجہ ہے ان کی آزادی اور حریت کا اور ہمارے آدمیوں کی سستی اور غفلت نتیجہ ہے ان کی غلام ذہنیت کا۔ اگر یہ ذہنیت مٹ جاتی اور وہ سمجھ لیتے کہ ترقی کا صرف ایک ہی ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اور بھی بیسیوں ذرائع خدا تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں تو وہ سستی اور غفلت میں مبتلا ہونے کے بجائے جدوجہد کرتے اور ایثار و قربانی سے کام لیتے اور پھر دیکھتے کہ اس کے کیسے خوشگوار نتائج نکلتے ہیں۔ جیسے ہماری جماعت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا ہے جو یہ آواز سنتے ہی کہ آؤ اور خدمت دین کیلئے اپنی زندگی وقف کر دو، نہایت خوشی اور بشارت کے ساتھ اپنی زندگی وقف کر دیتا اور غیر ممالک میں نکل جاتا ہے۔ چنانچہ بعض تو بغیر کسی سرمایہ کے غیر ممالک میں کام کر رہے اور نہایت اچھا نمونہ دکھا رہے ہیں۔

خدا م الامحمدیہ کے قیام کی غرض و غایت جماعت میں ارتقائی روح پیدا کرنا

تو مجالس خدا م الامحمدیہ کے قیام کی غرض یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے وہ مقاصد رکھے جائیں جن کے بغیر ان میں ارتقائی روح پیدا نہیں ہو سکتی اور جن کے بغیر جماعت کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس وقت ایک ذہنی آزادی عطا کی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ تھوڑے عرصہ کے اندر ہی (خواہ ہم اس وقت تک زندہ رہیں یا نہ رہیں) لیکن بہر حال وہ عرصہ غیر معمولی طویل پر لبانہیں ہو سکتا) ہمیں تمام دنیا پر نہ صرف عملی برتری حاصل ہوگی بلکہ سیاسی اور مذہبی برتری بھی حاصل ہو جائے

سچے احمدی کے دل میں غلامی کی روح پیدا ہی نہیں ہو سکتی کسی سچے احمدی کے دل میں غلامی کی روح پیدا نہیں کر سکتا۔ جب ہمارے سامنے بعض حکام آتے ہیں تو ہم اس یقین اور وثوق کے ساتھ ان سے ملاقات کرتے ہیں کہ کل یہ نہایت ہی عجز اور انکسار کے ساتھ ہم سے استمداد کر رہے ہوں گے۔ ہم انگریزی قوم کو عارضی طور پر مسلمانوں پر غالب دیکھتے ہیں۔ مگر مستقل طور پر اسے اسلام کا غلام بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہماری مثال اس وقت ایسی ہی ہے جیسے کوئی بڑا آدمی جب کسی چھوٹے آدمی کے ہاں بطور مہمان جاتا ہے تو کچھ عرصہ کیلئے وہ اس کے قوانین کا پابند ہوتا ہے جیسے رسول کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ خواہ کوئی کتنا بڑا آدمی ہو جب کسی دوسری جگہ جائے تو وہاں کے امام کے تابع ہو کر رہے، خواہ وہ امام چھوٹا ہی ہو۔ اسی طرح جب گورنر کسی دورہ پر جاتا ہے تو گو وہ بڑا ہوتا ہے مگر ڈپٹی کمشنر کی مرضی اور اس کے بنائے ہوئے پروگرام کے ماتحت اسے کام کرنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ جب شام میں گئے تو حضرت ابو عبیدہؓ جو وہاں کے امیر تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کا پروگرام کیا ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہاں میرا پروگرام نہیں بلکہ تمہارا پروگرام ہو گا اور جو کچھ تم کہو گے، اسی طرح میں کروں گا۔ اب حضرت عمرؓ کا اس وقت ماتحتی قبول کر لینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے کی غلامی پسند کر لی۔ عمرؓ بہر حال عمرؓ تھے۔ وہ حاکم تھے، روحانی بادشاہ تھے اور خلیفہ وقت تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ ان کے تابع تھے مگر تھوڑی دیر کے لئے حضرت عمرؓ نے بھی ان کی ماتحتی اختیار کر لی۔ اسی طرح ہم جو دنیوی حکام کو ملتے ہیں تو اس رنگ میں ملتے ہیں کہ انہیں اس وقت عارضی طور پر ہم پر برتری حاصل ہے۔ مگر ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ کل وہ ہمارے شاگرد ہوں گے اور ہر قسم کی ترقی کے حصول کے سبق وہ ہم سے سیکھیں گے۔ اگر اس خیال کو ہم اپنی جماعت کے افراد کے ذہنوں میں پورے طور پر زندہ رکھیں اور اسے مضبوط کرتے چلے جائیں تو ایک منٹ کے لئے بھی ہماری جماعت کے نوجوانوں کے دلوں میں غلامی کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ جیسے اس بالا افسر کے دل میں غلامی کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی چھوٹے افسر کے ہاں جاتا اور اس کے پروگرام کا پابند ہو جاتا ہے۔

خدا ملاحمدیہ کی غرض و غایت۔ سلسلہ کے وقار اور اسلام و احمدیت کی ترقی کے ضامن

پس جماعت کے تمام دوستوں کو چاہئے کہ اپنے اپنے ہاں نوجوانوں کو منظم کریں اور ان کی ایک مجلس بنا کر خدا ملاحمدیہ اس کا نام رکھیں اور انہیں سلسلہ کے وقار کے تحفظ اور اسلام و احمدیت کی ترقی کے لئے کام کرنے کی ترغیب دیں۔ گذشتہ خطبہ میں میں نے اس امر کی طرف جماعت کے دوستوں کو توجہ دلائی تھی۔ گواہی کے طور پر وقت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے میں بعض باتیں بیان نہیں کر سکا تھا اور میں نے کہا تھا کہ اگلے خطبہ میں میں ان باتوں

کو بیان کروں گا۔ اس وقت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگلے جمعہ کو تمام جماعتوں کے نمائندے آنے والے ہیں شاید آج اس مضمون کا کچھ حصہ رہ جانے میں یہی حکمت ہو کہ میں جماعت کے تمام دوستوں کو براہ راست اس امر کی طرف توجہ دلاؤں کیونکہ اخبار میں خطبہ کا پڑھ لینا اور بات ہے اور زبان سے کوئی بات سننا اور اثر رکھتا ہے۔ پس اب چونکہ تمام جماعتوں کے نمائندے یہاں آئے ہوئے ہیں اس لئے میں ان سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں جا کر نوجوانوں میں یہ تحریک کریں کہ وہ خدام الاحمدیہ نام کی مجالس قائم کریں۔ اس مجلس کے قواعد میں تجویز کر رہا ہوں اور بعض موٹے موٹے قواعد جو میں نے بتائے تھے وہ تو غالباً مجلس خدام الاحمدیہ کے ارکان نے شائع بھی کر دیئے ہیں۔ لیکن بہر حال تفصیلی قواعد انہیں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت اس کے ایک اور حصہ کی طرف میں جماعت کے دوستوں کو بالخصوص مرکزی مجلس خدام الاحمدیہ کو توجہ دلاتا ہوں اور وہ یہ کہ نوجوانی میں بے شک خدمت دین کا کام کرنا اچھا ہوتا ہے کیونکہ ادھیڑ عمر میں بعض دفعہ انسان ان کاموں کے کرنے کی ہمت کھو بیٹھتا ہے۔

مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور کام ہے اور وہ یہ کہ بچوں کے بچوں میں اخلاق حسنہ کی داغ بیل ڈالنا اندر بھی یہی جذبات اور یہی خیالات پیدا کئے جائیں کیونکہ بچپن میں ہی اخلاق کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض کاموں کی داغ بیل جوانی میں پڑتی ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بعض کاموں کی داغ بیل بچپن میں پڑتی ہے۔ جوانی میں جن کاموں کی داغ بیل پڑتی ہے وہ بالعموم عملی ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے انسان کا ذہن برے اور بھلے کی تمیز کر لیتا ہے، مگر تو میں صرف برے اور بھلے کی تمیز سے ہی ترقی نہیں کیا کرتیں بلکہ قوم کی ترقی کے لئے اچھی عادتوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بے شک عادت بعض لحاظ سے نقصان رساں بھی ہوتی ہے، مگر عادت درحقیقت قومی ترقی کا ایک ضروری حربہ بھی ہوتی ہے۔ کسی قوم کو نیک اخلاق کی عادت ڈال دو، وہ خود بخود باقی اقوام پر غالب آنے لگ جائے گی۔ اسی طرح جب کسی قوم میں بد عادت پیدا ہو جائیں، وہ خود بخود گرتی چلی جاتی ہے اور اگر اسے کسی بات کی بھی عادت نہ ڈالو تو اس قوم میں ایک تزلزل رہے گا۔

کبھی اخلاقی رو غالب آگئی تو وہ ترقی کر جائے گی اور اگر اخلاقی رو دب گئی تو وہ گر جائے گی۔ تو اصل حقیقی چیز یہ ہے کہ اچھی عادت بھی ہو اور علم بھی ہو۔ مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب عادت کے زمانہ کی بھی اصلاح کی جائے اور علم کے زمانہ کی بھی اصلاح کی جائے۔ عادت کا زمانہ بچپن کا زمانہ ہوتا ہے اور علم کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ پس خدام الاحمدیہ کی ایک شاخ ایسی بھی کھولی جائے جس میں پانچ چھ سال عمر کے بچوں سے لے کر پندرہ سولہ سال کی عمر تک کے بچے شامل ہو سکیں یا اگر کوئی اور حد بندی تجویز ہو تو اس کے ماتحت بچوں کو شامل کیا جائے۔

بچوں کی اصلاح کے نگران بڑی عمر کے لوگ ہوں ان کے الگ نگران مقرر ہونے چاہئیں۔ مگر یہ امر مد نظر رکھنا چاہئے کہ ان بچوں کے نگران نوجوان نہ ہوں بلکہ بڑی عمر کے لوگ ہوں۔ پس خدام الاحمدیہ کو اس مقصد کے ماتحت اپنے اندر کچھ بوڑھے نوجوان بھی شامل کرنے چاہئیں۔ یعنی ایسے لوگ جن کی عمریں گویا زیادہ ہوں مگر ان کے دل جوان ہوں اور وہ خدمت دین کے لئے نہایت بشاشت اور خوشی سے کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ایسے لوگوں کے سپرد بچوں کی نگرانی کی جائے اور ان کے فرائض میں یہ امر داخل کیا جائے کہ وہ بچوں کو پنجوقتہ نمازوں میں باقاعدہ لائیں، سوال و جواب کے طور پر دینی اور مذہبی مسائل سمجھائیں، پریڈ کرائیں اور اسی طرح کے اور کام ان سے لیں۔

بچوں میں تین بنیادی عادات پیدا کر دی جائیں نماز کی عادت ان میں پیدا ہو جائے۔ اگر یہ تین عادتیں ان میں پیدا کر دی جائیں تو یقیناً جوانی میں ایسے بچے بہت کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ پس بچوں میں محنت کی عادت پیدا کی جائے، سچ بولنے کی عادت پیدا کی جائے اور نمازوں کی باقاعدگی کی عادت پیدا کی جائے۔ نماز کے بغیر اسلام کوئی چیز نہیں۔ اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں میں اسلامی روح قائم رکھے تو اس کا فرض ہے کہ اپنی قوم کے ہر بچہ کو نماز کی عادت ڈالے۔

قومی ترقی کے تین معیار۔ اطفال کی تربیت کا اصولی پروگرام درست نہیں ہو سکتے۔ جس قوم میں سچ نہیں، اس قوم میں اخلاق فاضلہ بھی نہیں اور محنت کی عادت کے بغیر سیاست اور تمدن کوئی چیز نہیں۔ جس قوم میں محنت کی عادت نہیں اس قوم میں سیاست اور تمدن بھی نہیں۔ گویا یہ تین معیار ہیں جن کے بغیر قومی ترقی نہیں ہوتی۔ پس خدام الاحمدیہ کے ارکان کو چاہئے کہ اپنی ایک شاخ بچوں کی بھی قائم کریں۔ مگر ان کے نگران ایسے لوگ مقرر کریں جو کم سے کم چالیس سال کے ہوں اور بہتر ہو گا اگر وہ اس سے بھی زیادہ عمر کے ہوں اور اپنے اندر ہمت اور استقلال رکھتے ہوں۔ ان کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ وہ بچوں کو اپنی نگرانی میں کھلائیں، انہیں وقت ضائع کرنے سے بچائیں، نمازوں کے لئے باقاعدہ لے جائیں اور اخلاق فاضلہ ان میں پیدا کریں اور گو تفصیلی طور پر تمام اخلاق کا پیداکرنا ہی ضروری ہے، مگر یہ تین باتیں خاص طور پر ان میں پیدا کی جائیں۔ یعنی نمازوں کی باقاعدگی کی عادت، سچ کی عادت اور محنت کی عادت۔ باقی ہمارے ملک میں بعض اور بھی اخلاقی خرابیاں ہیں جن کا دور کرنا ضروری ہے۔

مثلاً ہمارے ملک میں گالی دینے کا عام طور پر رواج ہے اور اس بچوں سے گالی گلوچ کی عادت دور کرو میں شرم و حیا سے کام نہیں لیا جاتا۔ مجھے یاد ہے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کو جب چوٹ لگی تو مرہم پٹی کرنے کے لئے ایک مخلص دوست مقرر تھے۔ مگر ان کی زبان پر بہن کی گالی بہت چڑھی ہوئی تھی۔ ایک دن جب کہ حضرت خلیفہ اول کے پاس ہم سب بیٹھے ہوئے تھے اور باہر سے بھی کچھ مسمان آئے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے برسبیل تذکرہ دریافت کیا۔ ابھی حضرت صاحب کا زخم اچھا نہیں ہوا۔ اس پر وہ بے اختیار زخم کو بہن کی گالی دے کر کہنے لگے یہ اچھا ہونے میں آتا ہی نہیں۔ حضرت خلیفہ اول اس وقت سامنے بیٹھے تھے اور باقی سب دوست بھی موجود تھے۔ ان کے منہ سے جب اس مجلس میں یہ گالی نکلی تو ہم سب پر ایک سکتے کی حالت طاری ہو گئی۔ مگر پھر ہم یہی سمجھ کر خاموش ہو رہے کہ ان بچاروں کو اس گالی کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ تو گالی دینے کی عادت ہی جب کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے اس کا مٹانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور کئی قسم کی بری عادتیں ہیں جو ہمارے ملک میں لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ ان عادتوں کو مٹا کر ان کی جگہ اگر نیک عادتیں پیدا کر دی جائیں تو لازماً قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ پس مجلس خدام الاحمدیہ کے ارکان کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ نوجوانوں کی اصلاح کریں بلکہ ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کی اصلاحی شاخ الگ قائم کریں اور اس کے ذریعہ جو چھوٹی عمر کے بچے ہیں ان کی تربیت کریں۔ میں اس کے لئے بھی انشاء اللہ تعالیٰ انہیں قواعد تیار کر دوں گا۔ سردست جو تین باتیں میں نے بتائی ہیں ان پر انہیں عمل کرنا چاہئے۔ یعنی بچوں میں نماز کی عادت، سچ کی عادت اور محنت کی عادت پیدا کرنی چاہئے۔ محنت کی عادت میں آوارگی سے بچنا خود بخود آ جاتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہاں کی مجلس خدام الاحمدیہ بھی اور بیرونی جماعت کی مجالس بھی ان اصول کے ماتحت اپنے کام کو محنت سے سرانجام دیں گی۔

اور خدمت خلق کے کام کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھیں گی۔ میں خدمت خلق کے کام کو عار نہ سمجھو نے بار بار بتایا ہے کہ خدمت خلق کے کام میں جہاں تک ہو سکے وسعت اختیار کرنی چاہئے اور مذہب اور قوم کی حد بندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دور کرنا چاہئے۔ خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی ہو یا سکھ۔ ہمارا خدا رب العالمین ہے اور جس طرح اس نے ہمیں پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے ہندوؤں اور سکھوں اور عیسائیوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ پس اگر خدا ہمیں توفیق دے تو ہمیں سب کی خدمت کرنی چاہئے۔ یہاں قادیان میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہم عارضی طور پر ہندوؤں سے سو، ا نہیں خریدتے۔ مگر بیسیوں ہندو اور سکھ ہمارے پاس امداد کے لئے آتے رہتے ہیں اور ہم ہمیشہ ان کی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کانگریس کی ایک مشہور لیڈر یہاں آئیں اور انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ یہاں کے ہندوؤں کو بہت تکلیف ہے۔ میں نے کہا میں ایسی بیسیوں مثالیں دے سکتا ہوں کہ جب یہ ہندو میرے پاس آئے اور میں نے ان کی امداد کی اور ان پر بڑے بڑے احسان کئے۔ چنانچہ بعض واقعات میں نے انہیں بتائے بھی۔ وہ میری

باتیں سن کر حیران ہو گئیں اور کہنے لگیں یہ بات ہے۔ میں نے کہا آپ ان سے پوچھ لیجئے کیا آیا فلاں فلاں مواقع پر میں نے ان کی مدد کی ہے یا نہیں۔

اور اب بھی میں ان کے ساتھ خدمت خلق رنگ، نسل، خون، مذہب کی تمیز سے بالا ہو کر کرو۔ موقع ملنے پر حسن سلوک ہی کرتا ہوں۔ مگر انہوں نے پھر ہندوؤں سے پوچھا نہیں۔ شاید میری بات پر ہی اعتماد کر لیا یا انہیں پوچھنے کا موقع نہ ملا، تو حسن سلوک میں کسی مذہب کی قید نہیں ہونی چاہئے اور جو شخص بھی اس قسم کے حسن سلوک میں مذہب کی قید لگا تا اور اپنے ہم مذہبوں کی خدمت کے کام کرنا تو ضروری سمجھتا مگر غیر مذہب والوں کی خدمت کرنا ضروری نہیں سمجھتا وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے اور دنیا میں لڑائی جھگڑے کی روح پیدا کرتا ہے۔

پھر جو تبلیغی جماعتیں ہوتی ہیں ان کے لئے تو یہ بہت ہی ضروری تبلیغی جماعتوں کیلئے ایک ضروری امر ہوتا ہے کہ وہ ساری قوموں سے حسن سلوک کریں اور کسی کو بھی اپنے دائرہ احسان سے باہر نہ نکالیں تا تمام قومیں ان کی مداح بنیں۔ پس وہ خدمت خلق کے کاموں میں مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر حصہ لیں اور جماعت کے جو اغراض اور مقاصد ہیں ان کو ایسی وفاداری کے ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں کہ خدا تعالیٰ کے راستے میں ان کے لئے اپنی جان قربان کر دینا کوئی دو بھرنہ ہو۔ جب کسی قوم کے نوجوانوں میں یہ روح پیدا ہو جائے کہ اپنے قومی اور مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لئے جان دے دینا وہ بالکل آسان سمجھنے لگیں اس وقت دنیا کی کوئی طاقت انہیں مار نہیں سکتی۔ جس چیز کو مارا جا سکتا ہے وہ جسم ہے۔ مگر جس شخص کی روح ایک خاص مقصد لیکر کھڑی ہو جائے اس روح کو کوئی فنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، بلکہ ایسی قوم کا اگر ایک شخص مرے تو اس کی جگہ دس پیدا ہو جاتے ہیں۔

جسم مر سکتا ہے لیکن اعلیٰ مقصد کو لے کر اٹھنے والی روح نہیں مر سکتی میں ہمیشہ یہ سمجھا کرتا ہوں کہ قصے کہانیوں میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں نے ایک دیو مارا تو اس کے خون کے قطروں سے دس دیو اور پیدا ہو گئے۔ یہ ذہنی قتل کے ناممکن ہونے کو ایک تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے اور اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جب کسی قوم کے ذہن میں راسخ طور پر کوئی نیک عقیدہ پیدا ہو جائے اس وقت اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا اور اگر اس قوم کے کسی فرد پر کوئی شخص ہاتھ اٹھاتا ہے اور اسے قتل کرتا ہے تو اس کی موت ایسی شاندار موت ہوتی ہے کہ ہزاروں اس کے قائم مقام پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ یہ نظارہ نظر آیا ہے اور اب بھی یہ نظارہ نظر آ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہمارے نوجوان یہی روح اپنے اندر پیدا کریں۔ پھر نہ انہیں وطن میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ غیر ملک میں ان کو کوئی مٹا سکتا ہے کیونکہ وہ اس روح کے نتیجے میں وہی لوگ بن جائیں گے جن کو ای دنیا میں خدا تعالیٰ ایسی زندگی دے دیتا ہے جس پر موت نہیں آتی اور ایسی حیات دے دیتا ہے جس پر فنا طاری نہیں ہوتی۔ چونکہ اب نماز کے بعد

مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہونے والا ہے اس لئے میں خطبہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو فرض شناسی کی توفیق عطا فرمائے اور جماعت کے دوسرے افراد کے دلوں میں بھی ایسی روح پیدا کرے کہ وہ دوبارہ اسی اسلام کو دنیا میں قائم کر کے دکھادیں جس اسلام کو آج سے تیرہ سو سال پہلے رسول کریم ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔“

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء از اخبار ”الفضل“ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء)